شذرات

قرآنیات

معارف نبوی

اصلاح و دعوت

وفیات

تبصرہ کتب

جاوید احمد غامدی

مباشرت کے حدود

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ بیوی کے ساتھ منہ یا دبر کے راستے سے جنسی تعلق قائم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عورتوں سے ملاقات لازماً اُسی راستے سے ہونی چاہیے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ'* (تو اُن سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے)۔ یہ چیز بدیہیات فطرت میں سے ہے اور اِس پہلو سے، لاریب خدا ہی کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص اِس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا کے ایک واضح، بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اِس پر یقیناً اُس کے ہاں سزا کا مستحق ہو گا۔

یہ آیت جہاں آئی ہے، قرآن نے یہی بات اِس کے بعد کھیتی کے استعارے سے واضح فرمائی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادہ پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اِس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اِسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اُس سے قضاے شہوت نہ کی جائے، اِس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت واضاعت ہے۔ اِس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اِس کا ارتکاب جائز نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۷)

---

*البقرہ ۲: ۲۲۲

اِس کے بعد 'فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ'* (لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہے، آؤ) کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''...(اِس) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اُس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اُس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اِس دوسری چیز کی طرف 'حَرْثَ' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف 'اَنّٰى شِئْتُمْ' کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اُس رویے کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملے میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اِس اطمینان میں ہے کہ اُن کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اِس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اِس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اِس نشہ سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اُس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اُس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں، بلکہ اُس کی اپنی کھیتی ہے، اِس وجہ سے وہ اِس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اِس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اِس کے کسی آنے میں بھی اِس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۷)

یہ ہدایات کس درجہ اہمیت رکھتی ہیں؟ قرآن نے سورۂ بقرہ کی اِنھی آیات میں اِسے 'اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ'* (بے شک، اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ آیت کے اِس حصے کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح کی ہے:

''...توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اِس اعتبار سے دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ اِن سے محروم ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات آئی ہے، اُس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے

---

*البقرہ ۲:۲۲۳۔

*البقرہ ۲:۲۲۲۔

میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضاے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا
لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿۸﴾ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا

تم پر[۸] (اے پیغمبر)، اگر ہم کوئی ایسی کتاب اتار دیتے جو کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اُس کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ بھی لیتے، تب بھی یہ منکرین یہی کہتے کہ یہ کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے[۹]۔ کہتے ہیں کہ اِس نبی پر (علانیہ) کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ (یہ احمق نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم نے کوئی فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک فیصلہ ہو جاتا، پھر اِن کو کوئی مہلت نہ ملتی[۱۰]۔ اور (نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم کوئی

۸؎ یہاں سے آگے اُن اعتراضات اور مطالبات کا جواب دیا ہے جو منکرین اپنے اعراض کے لیے بہانے کے طور پر پیش کر رہے تھے۔

۹؎ یعنی اعراض کا سبب چونکہ وہ نہیں جو بیان کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننا نہیں چاہتے، اِس لیے اِن کا یہ مطالبہ پورا بھی کر دیا جائے تو اِسی طرح کی باتیں کریں گے۔ یاد رہے کہ یہ اُسی مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبان سے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۵۳ میں نقل ہو چکا ہے۔

عَلَیۡهِمۡ مَّا یَلۡبِسُوۡنَ ﴿۹﴾ وَ لَقَدِ اسۡتُهۡزِیَٔ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِیۡنَ
سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۰﴾ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ
انۡظُرُوۡا كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِیۡنَ ﴿۱۱﴾

قُلۡ لِّمَنۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ قُلۡ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ
لَیَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا

فرشتہ بنا کر بھیجتے تو اُسے بھی انسان کی صورت ہی میں بھیجتے۔[11] اور (اِس طرح) اِن کو اُسی شبہے میں ڈال دیتے جس میں یہ اب پڑے ہوئے ہیں۔[12] حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو اُن کے مخاطبین میں سے مذاق اڑانے والوں کو اُسی چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اِن سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے۔[13] ۷-۱۱

اِن سے پوچھو، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، وہ کس کا ہے؟ کہہ دو، اللہ ہی کا ہے۔[14] اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔[15] وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور روز قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں

۱۰؎ یہ اِس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ جب پردے اٹھا دیے جائیں گے اور لوگ حقائق کو بچشم سر دیکھ لیں گے تو کسی کا ایمان اُس کے لیے نافع نہ ہوگا۔ ایمان وہی معتبر ہے جو غیب میں رہتے ہوئے اور عقل و فطرت کے اُن دلائل کی بنیاد پر لایا جائے جس کی دعوت انبیا علیہم السلام نے دی ہے۔

۱۱؎ اِس لیے کہ انسان اُسے انسانوں کی شکل ہی میں دیکھ سکتے اور اُس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

۱۲؎ شبہے میں ڈالنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یہ اُس ضابطے اور قانون کی نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

۱۳؎ یہ صرف اجمالی اشارہ ہے۔ اِس کی تفصیل آگے سورۂ اعراف (۷) میں آئے گی۔

۱۴؎ سوال کے بعد مخاطب کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دینے کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب کے لیے انکار کی گنجایش نہیں ہوتی اور سوال سے مقصود بھی اصلاً اُس کے کسی مسلمہ کی

يُؤْمِنُوْنَ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴿۱۳﴾
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ

کوئی شبہ نہیں[۱۶]۔ اِس کو وہی لوگ نہیں مانتے جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کر لیا ہے[۱۷]۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جو کچھ رات میں ٹھیر جاتا اور دن میں (متحرک ہوتا ہے[۱۸])، وہ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ سمیع و علیم ہے[۱۹]۔ ۱۲-۱۳

کہہ دو، اللہ کے سوا کیا میں کسی اور کو اپنا کارساز بنالوں جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور کھاتا نہیں

طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔

۱۵؎ یعنی صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہے، لہٰذا اپنی اِس صفت کے تقاضے بھی لازماً پورے کرے گا۔

۱۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'۔ اِن میں 'اِلٰى' کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی تفسیر میں لکھا ہے:

''...قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک، نعوذ باللہ، عدل و ظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر دونوں یکساں ہیں۔ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اِس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اُس کی رحمت کامل کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں، وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۷)

۱۷؎ اِس مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرما دی ہے کہ قیامت کے دن یہ خسارے میں مبتلا لوگ کس طرح حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے کس بے بسی کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔

۱۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَالنَّهَارِ'۔ 'سَكَنَ' کے بالمقابل 'ما تحرك' یا اِس کے ہم معنی کوئی لفظ یہاں عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۹؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی قدرت سب کو محیط اور اُس کا علم سب کو حاوی ہے۔ شب و روز میں کوئی چیز اُس کے

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ وَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۴﴾ قُلۡ
اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾ مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡہُ
یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَہٗ ؕ وَذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۶﴾
وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ؕ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَہُوَ

کھلاتا ہے[20]؟ کہہ دو، مجھے تو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے سامنے سر اطاعت جھکا دوں اور (تاکید کی گئی ہے کہ) تم ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو[21]۔ کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک ہولناک دن کے عذاب سے دوچار ہو جاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اُس دن عذاب سے دور رکھا گیا، وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے[22]۔ ۱۴-۱۶

(یقین رکھو کہ) اگر اللہ تمھیں کسی رنج میں مبتلا کر دے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو اُسے دور کر سکے

حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ وہ جب چاہے گا، ہر جگہ سے سب کو بلائے گا اور اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔

۲۰؎ یہ اوپر کی بات کا لازمی نتیجہ بھی ہے اور مشرکین پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کے خالق اور پوری کائنات کے رازق کو چھوڑ دوں اور تمھارے اُن بتوں کو معبود بنالوں جو اپنے وجود کے لیے بھی تمھارے محتاج ہیں اور اُن کے سامنے تم حلوے مانڈے پیش کرتے ہو تو راضی اور آسودہ ہوتے ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں، اِس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ اُن کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اِس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے، اُس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا، بلکہ سب کا سب خدا کے حق دار بندوں کو پہنچتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۹)

۲۱؎ یعنی تم شرک کرتے ہو تو کرو، اِس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ مجھے تو اِسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں رہوں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں۔ اِس مضمون کے لیے اصل میں 'لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تاکید کے ساتھ ایک نوعیت کا زجر بھی ہے، لیکن اِس کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کا رویہ زیر بحث ہے۔

۲۲؎ اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ جو لوگ اِس کامیابی کو بھولے ہوئے ہیں، اُس دن اُنھیں اندازہ ہو جائے گا

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾ وَھُوَ الۡقَاھِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ وَھُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۸﴾
قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَھَادَۃً قُلِ اللّٰہُ شَھِیۡدٌ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا
الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡ بَلَغَ اَئِنَّکُمۡ لَتَشۡھَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخۡرٰی قُلۡ
لَّآ اَشۡھَدُ قُلۡ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۹﴾
اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَھُمۡ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡٓا

اور اگر بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۲۳]۔ اپنے بندوں پر وہ ہر لحاظ سے حاوی ہے اور حکیم و خبیر ہے[۲۴]۔ اِن سے پوچھو، کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہہ دو، اللہ، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن اِس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے تمھیں خبردار کر دوں اور اُنھیں بھی جنھیں یہ پہنچے[۲۵]۔ کیا تم اِس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اِس کی گواہی نہیں دے سکتا۔ کہہ دو وہ ایک ہی معبود ہے اور میں اُن سے بری ہوں جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے، وہ اِس (قرآن) کو پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو

کہ کس بدبختی اور محرومی کا سامان کر کے دنیا سے آئے ہیں۔

۲۳؎ یہ اوپر والی بات کی توضیح مزید ہے کہ جب نفع و ضرر سب خدا کے اختیار میں ہے تو کسی دوسرے کو مولیٰ و مرجع کیوں بنایا جائے؟ اور اُس کے حضور میں دعا و مناجات کے لیے ہاتھ کیوں اٹھائے جائیں؟

۲۴؎ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ دنیا کو کسی انجام اور غایت تک پہنچائے بغیر چھوڑ دے۔ اُس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک روز جزا برپا ہو جس میں حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں۔

۲۵؎ یہ وہی بات ہے جو سورۂ فرقان (۲۵) آیت ۱ میں 'لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن روز قیامت تک ذریعۂ انذار ہے۔ علما جب اِس کی دعوت لے کر اُٹھیں تو اُنھیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے اِسی کو ذریعۂ انذار بنانا چاہیے۔ خدا کی معرفت اور عقبہ شناسی کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے جو لوگوں کو پیدا کر سکے۔

اَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿٢٠﴾ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ
كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿٢١﴾ وَيَوۡمَ نَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ
لِلَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَيۡنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمۡ تَكُنۡ فِتۡنَتُهُمۡ
اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ ﴿٢٣﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ كَذَبُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ

پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے، البتہ اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رکھا ہے، وہ اِسے نہیں مانتے[٢٦] (اور شرک پر اصرار کرتے ہیں، دراں حالیکہ) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلا دے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ (اِس لیے) اُس دن کو یاد رکھو جس دن ہم اِن سب کو اکٹھا کریں گے[٢٧]، اِس کے بعد اِن مشرکوں سے پوچھیں گے کہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جنھیں تم (خدا کا ساجھی) گمان کرتے تھے؟ پھر اِن کا فریب ختم ہو جائے گا، مگر کہیں گے[٢٨]: اللہ، ہمارے پروردگار کی قسم، ہم مشرک نہیں تھے[٢٩]۔ دیکھو، اِن (ظالموں) نے کس طرح

٢٦؎ اوپر قرآن کا ذکر جس مقصد سے ہوا ہے، اُس کی توثیق مزید کے لیے یہ صالحین اہل کتاب کی گواہی پیش کی ہے۔ فرمایا ہے کہ قرآن کے انذار پر ایمان لانے سے وہی محروم ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال رکھا ہے، ورنہ صالحین اہل کتاب تو اُس کو اور اُس کے پیش کردہ حقائق کو اپنے صحیفوں کی روشنی میں اُسی طرح جانتے، پہچانتے اور اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے یوسف گم گشتہ کو پہچانتا ہے اور اُس کے پیرہن کی خوشبو دور ہی سے محسوس کر لیتا ہے۔

٢٧؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَوۡمَ نَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا'۔ اوپر جن گروہوں کا ذکر ہوا ہے، لفظ 'جَمِيۡعًا' کی تاکید نے اُن سب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے، خواہ وہ خدا کے شریک ٹھیرانے والے ہوں، قیامت کا انکار کرنے والے ہوں یا آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے۔ یہ سب اگرچہ مشرکین تھے، مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوہ تکذیب میں کسی حد تک الگ الگ بھی تھے۔

٢٨؎ اصل میں لفظ 'فِتۡنَة' آیا ہے۔ اِس کی اضافت فاعل کی طرف ہے، جملے میں استثنا منقطع ہے اور انداز کلام طنزیہ ہے۔ یعنی جس طرح کے فریب دنیا میں دیتے رہے، اُس کی گنجایش ختم ہو جائے گی۔ ہاں، کچھ کر سکیں گے تو یہی کہ

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾
وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ
اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ

خود اپنے اوپر جھوٹ بولا ہے اور جو افترا یہ کرتے رہے، وہ سارا ہوا ہو گیا ہے۔[30] ۲۰-۲۴

اِن میں ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر تمھیں سنتے ہیں، مگر اِن کے دلوں پر ہم نے (اپنے قانون کے مطابق[31]) پردے ڈال دیے ہیں کہ (جو کچھ سنتے ہیں)، اُسے نہ سمجھیں اور اِن کے کانوں کو بہرا کر دیا ہے (کہ سن کر بھی نہ سنیں)۔ یہ اگر ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں، پھر بھی ایمان نہ لائیں گے۔[32] یہاں تک کہ

اپنے جرم کا انکار کر کے اُس کی پاداش سے بچنے کی کوشش کریں۔

۲۹؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین اُس روز اپنے شرک کا اقرار کر لیں گے۔ یہاں انکار کا ذکر ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریشان ہو کر کسی مرحلے میں انکار کریں گے اور کسی میں بالآخر ماننے پر مجبور ہو جائیں گے، بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی کہ جو صورت حال درپیش ہوگئی ہے، شاید اُس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا ہو سکے۔

۳۰؎ اِس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں خدا کے بارے میں جھوٹی گواہی دیتے رہے اور یہاں اپنے اوپر جھوٹ گھڑ رہے ہیں۔

۳۱؎ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت ملتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُس کے دل و دماغ کو دعوت حق کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ خدا کا عذاب ہے جس سے وہ اپنی شامت اعمال کے نتیجے میں مرنے سے پہلے ہی دوچار ہو جاتا ہے۔ اِس قانون کی وضاحت کے لیے دیکھیے: سورۂ نساء (۴) آیت ۱۵۵، اعراف (۷) آیات ۱۰۰-۱۰۲، نحل (۱۶) آیات ۱۰۶-۱۰۸ اور صف (۶۱) آیت ۵۔

۳۲؎ یہ محض مبالغے کا ایک اسلوب نہیں، بلکہ بیان حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ اِن کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ اِن کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ
وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ
وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا
نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾

تمھارے پاس حجت کرتے ہوئے آئیں گے تو یہ منکرین کہیں گے کہ یہ تو محض اگلوں کے افسانے ہیں[۳۳]۔ یہ اِس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کر جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں، مگر اِس کا احساس نہیں کرتے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے، پھر کہیں گے: کاش، ہم واپس بھیج دیے جائیں کہ تصدیق کریں اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں[۳۴] اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ (ہرگز نہیں)، بلکہ وہ حقیقت اِن کے لیے بے نقاب ہو گئی ہے جو اِس سے پہلے چھپائے ہوئے تھے۔ اگر اِنھیں لوٹایا جائے تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے[۳۵]۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر، ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے، لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، اُن کا کیا علاج؟ جس طرح اِن سارے عجائب اور کرشموں سے اِن کی آنکھیں بند ہیں، اگر اور کرشمے بھی اِن کو دکھا دیے جائیں، جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۳۴)

۳۳؎ یعنی قرآن جب عاد و ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون کی تباہی کے واقعات سنا کر اِنھیں خبردار کرتا ہے تو اُس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے بوکھلا کر کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، یہ تو پچھلی قوموں کے بے سروپا افسانے ہیں جو معاذ اللہ، ایک سرپھرا سناتا پھر رہا ہے۔

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَا نُكَذِّبَ'۔ یہ مضارع خفیف ہے، لیکن تمنی کا جواب نہیں ہے۔ اِس کا نصب دلیل ہے کہ تمنی کا جواب یہاں اِس کا معطوف علیہ ہے جو حذف کر دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ
وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمُ
السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ
عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ

کہتے ہیں[۳۶] کہ زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد ہم ہرگز نہ اٹھائے جائیں گے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے۔ وہ اِن سے پوچھے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ جواب دیں گے: ہاں، ہمارے پروردگار کی قسم، یہ حقیقت ہے۔ وہ فرمائے گا: تو اپنے انکار کی پاداش میں اب چکھو عذاب کا مزہ۔ یقیناً گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے (اِس) ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی آ پہنچے گی تو کہیں گے: افسوس، ہماری اِس کوتاہی پر جو اِس معاملے میں ہم سے ہوئی ہے اور حال یہ ہوگا کہ اپنے بوجھ وہ اپنی پیٹھوں پر

”...تمنا کے جواب میں 'فنصدق' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا، اِس وجہ سے اُس کو حذف کر دیا اور 'وَلَا نُکَذِّبَ' میں جو حرف عطف ہے، اُس کے ذریعے سے محذوف کا پتا دے دیا۔ 'وَلَا نُکَذِّبَ' کے اظہار میں جو بلاغت ہے، وہ یہ ہے کہ اِس سے اُن کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں، لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش، ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور اُن کی تکذیب نہ کریں۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۳۶)

۳۵؎ اِس لیے کہ اِن کے جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بات اِن پر واضح نہیں ہوئی۔ یہ جان گئے تھے کہ خدا کے پیغمبر جو کچھ پیش کر رہے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔ اِن کی آنکھوں پر اُس وقت بھی دنیا کی محبت اور غرور و حسد کے جذبات میں پردے ڈال دیے تھے اور اب بھی لوٹا دیے جائیں تو یہی چیزیں حجاب بن کر قبول حق سے اِنھیں روک دیں گی۔

۳۶؎ قرآن مجید کے مکذبین کے بعد اب آگے مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو مرنے کے بعد

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل تماشا ہے۔ آخرت کا گھر، البتہ کہیں بہتر ہے اُن کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ۲۹-۳۲

اٹھائے جانے کو یا تو مانتے ہی نہیں تھے یا بعید از امکان کہہ کر گریز و فرار کے راستے نکال لیتے تھے۔

[باقی]

طالب محسن

ناقصات عقل

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ، تَصَدَّقْنَ وَأَكْثِرْنَ الِاسْتِغْفَارَ. فَإِنِّي رَأَيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ. فَقَالَتْ اِمْرَأَةٌ مِنْهُنَّ، جَزْلَةٌ: وَمَا لَنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ؟ قَالَ: تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ. وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ. وَمَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَ دِيْنٍ أَغْلَبَ لِذِي لُبٍّ مِنْكُنَّ. قَالَتْ: يَارَسُولَ اللّٰهِ، وَمَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ وَالدِّينِ؟ قَالَ: أَمَّا نُقْصَانُ الْعَقْلِ فَشَهَادَةُ اِمْرَأَتَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ. فَهٰذَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ. وَتَمْكُثُ اللَّيَالِيَ مَا تُصَلِّي وَتُفْطِرُ فِي رَمَضَانَ. فَهٰذَا نُقْصَانُ الدِّينِ.

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عورتو، تم صدقہ کیا کرو اور بہت زیادہ استغفار کیا کرو۔ مجھے تم عورتوں کی زیادہ تعداد جہنم میں دکھائی گئی ہے۔ ان میں سے ایک سمجھ بوجھ والی عورت نے حضور سے پوچھا۔ ہمارے ساتھ کیا ہے کہ ہم زیادہ جہنمی ہوں گی۔ آپ نے فرمایا: تم لعنت ملامت بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری ہوتی ہو۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی تمھاری طرح عقل و دین میں کم ہونے کے باوجود عقل والے پر غالب آ جائے۔ اس نے پوچھا: یارسول اللہ، یہ عقل و دین میں کمی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: عقل کی کمی یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے، یہ عقل کی کمی

ہے۔تم کئی دن نماز نہیں پڑھتی ہواور رمضان میں روزے نہیں رکھتی ہو یہ دین میں کمی ہے‘۔

لغوی مباحث

معشر :’معشر‘ کا لفظ ہراس گروہ کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی ایک امر میں مشترک ہو۔

رأیتکن :اگر چہ یہاں مخاطب کی ضمیر آئی ہے۔لیکن یہاں محض مخاطب عورتیں مراد نہیں بلکہ یہاں تمام عورتیں مراد ہیں۔ ہر زبان میں تخاطب کا اسلوب اس موقع پر بھی استعمال کرلیا جاتا ہے جہاں عمومی اصول بیان کرنا پیش نظر ہو۔ہمارے خیال میں یہاں صرف تم ترجمہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ تم عورتیں ترجمہ کیا جانا چاہیے تاکہ ترجمے ہی سے لفظ کا محل استعمال واضح ہو جائے۔

جزلة :’جزالة‘ کے معنی عقل کے ہیں یہ اسی سے صفت کا صیغہ ہے۔

عشیر :’عشیر‘ کا لفظ معاشرت سے ہے۔یعنی وہ جس کے ساتھ رہن سہن ہو۔اگر چہ یہ لفظ ہراس شخص کے لیے بولا جاسکتا ہے جس کے ساتھ گہرا میل جول ہو۔لیکن اس کا استعمال بالعموم شوہر یا بیوی ہی کے لیے ہوتا ہے۔

معنی

اس روایت میں دو بحثیں ہیں۔ایک بحث تو یہ ہے کہ ناشکری کیا جرم ہے۔ دوسری یہ کہ عورتیں واقعی مردوں کے مقابلے میں کم صلاحیت رکھتی ہیں۔

اس روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے جہنم کی سزا دی جائے گی۔شکر گزار ہونا انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔اس سے انحراف فطرت سے انحراف ہے۔جس طرح شکر گزاری ایک رویہ ہے جو بندگی کے لازمی عناصر میں سے ہے۔اسی طرح ناشکری بھی ایک رویہ ہے جو تمام زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔جس طرح شکر گزاری بندگی کی منازل طے کرانے میں قرب الٰہی کی ضامن ہے اسی طرح ناشکرا پن خدا سے بعد پر دلالت کرتا ہے۔ جو خدا کا شکر گزار ہو وہ بندوں کا ناشکرا نہیں ہوسکتا اور جو بندوں کا شکر گزار نہیں ہے اس کا امکان کم ہے کہ وہ حقیقت میں خدا کا شکر گزار ہو۔ جذبہ شکر تمام دین داری کی اساس ہے جو شخص زندگی کے کسی بھی دائرے میں اس سے محروم ہے وہ اس خطرے سے دوچار ہے کہ وہ بندگی کے دائرے ہی سے نکل جائے۔اس روایت میں معلوم ہوتا ہے کہ ناشکرے پن کی یہی شناعت واضح کی گئی ہے۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ناشکرا پن صرف عورتوں ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس روایت میں عورتوں کا ذکر بطور خاص صرف اس لیے ہوا ہے کہ اس وعظ کی مخاطب صرف وہ تھیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ شکر کا مضمون بیان ہوا ہے اور اس میں مرد و عورت دونوں یکساں مخاطب ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ جائز شکایت اور ناشکرا پن دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہاں ناشکرے پن کی مزمت ہوئی ہے۔ جائز شکایت اگر شوہر کی حیثیت کو مانتے ہوئے کی جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

اس روایت سے ایک اور حقیقت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ ہم انسانوں کی ضروریات جن افراد سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور ہماری توقعات جن افراد سے جڑ جاتی ہیں وہاں سب سے زیادہ شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی شکایتیں ہیں جو ان فوائد اور عنایات کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیتیں ہیں جو ہمیں فی الواقع حاصل ہیں۔ یہی چیز جب اعتدال سے تجاوز کرتی ہے تو ناشکرے پن میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ چیز عورتوں ہی کے ساتھ خاص نہیں مرد بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کسی ایک رشتے یا تعلق ہی کے ساتھ سامنے نہیں آتی ہر اس جگہ نمایاں ہو جاتی ہے جہاں ہماری کوئی ضرورت یا توقع وابستہ ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو اس چیز پر متنبہ کیا اور انھیں صدقہ خیرات سے اس کی تلافی کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ ہم انسان اپنی کمزوریوں کے باعث اس طرح کی کوتاہیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ توبہ واستغفار اور دوسری نیکیوں کے کرتے رہنے سے توقع ہے کہ ان کی تلافی ہوتی رہے گی اور ہم اللہ سے مغفرت پانے والوں میں شامل ہو جائیں۔

دوسری بحث عورت کی اہلیت سے متعلق ہے۔ اس روایت کے مطابق عورت دین اور عقل دونوں میں مرد سے پیچھے ہے۔ دین میں کمی کی مثال یہ ہے کہ عورت ایام کے دنوں میں نماز اور روزے نہیں رکھتی اس طرح اس کے دینی عمل میں کمی رہ جاتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے لیکن اس کا سبب واضح ہے کہ عورت خلقی ساخت ہے۔ یہ اس کی طرف سے کسی کمی یا کمزوری کے اظہار کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس طرح کے مسائل میں ہمیں معلوم ہے کہ خدا کی طرف سے اجر میں کمی نہیں کی جائے گی وہ خدا کی نیک بندیاں جو نماز کی پابند ہیں وہ بارگاہ ایزدی میں پابندی سے نماز پڑھنے والی ہی قرار پائیں گی اگرچہ اس سبب سے ان کی نمازوں کی تعداد کم ہو۔

عقل میں کمی کے لیے قرآن مجید کی آیت دین سے استشہاد کیا گیا ہے۔ آیت دین میں گواہی کا مسئلہ ارادے اور فیصلے پر مبنی ہے۔ کسی دستاویز پر شہادت ثبت کرنے والے کا انتخاب ہم خود کرتے ہیں۔ ہماری مراد یہ ہے کہ جرائم کا وقوع ہو یا حاثات ہوں وہاں گواہوں کی موجود محض اتفاق پر منحصر ہوتی ہے۔ وہاں ممکن ہے کوئی دیکھنے والا موجود ہی نہ

ہو اور محض قرائن پر معاملہ منحصر ہو کر رہ جائے۔ ممکن ہے صرف ایک عورت ہو، ممکن ہے کوئی بچہ ہو، ممکن کوئی بوڑھا ہو۔ لہٰذا اس طرح کے معاملات میں انھی گواہیوں پر انحصار کرنا پڑے گا جو وہاں موجود تھیں خواہ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ پھر خود قرآن مجید ہی سے واضح ہے کہ دستاویز پر گواہی میں ایک کے بجائے دو عورتوں کو رکھنے کا کیوں کہا گیا۔ ارشاد ہے کہ اگر ایک گڑبڑا جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ عورتوں سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے ممکن ہے گواہی کے موقع پر ایک عورت صحیح گواہی نہ دے سکے تو دوسری اسے یاد دلا کر گواہی کو درست کر دے۔

حقیقت میں یہ وہی فرق ہے جو شاعر اور پہلوان کا ہے۔ شاعر اور پہلوان بحیثیت شہری، بحیثیت مسلمان، بحیثیت شہری، بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ لیکن ان سے ہماری توقعات اور ان کا رول مختلف ہے۔ یہی معاملہ عورتوں کا ہے۔ فرق رول اور توقعات کا ہے۔ اگر فرق ہوتا تو جرم کی سزا میں فرق رکھا جاتا، عبادات میں فرق ہوتا، آخرت کی جوابدہی میں فرق ہوتا۔ روایت کا اصل مقصود عورت اور مرد کی افضلیت کا مسئلہ نہیں۔ رویے کی خرابی کی نشاندہی ہے۔ ہر انسان مزاج، صلاحیت، حالات میں دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس فرق کا اگر وہ شعور نہ رکھے اور دوسروں کے لیے مصیبت بنا رہے تو یہ چیز شکر کے رویے کے منافی ہے۔ چونکہ عورتیں ہی مخاطب ہیں اس لیے بات انھی کی مناسبت سے ہوئی ہے۔ لیکن اس سے جو اصولی بات واضح ہوتی ہے اس کے مخاطب مرد بھی ہیں۔

باقی رہا بیویوں کے شوہروں پر غلبے کا بیان تو یہاں اس کی شناعت ناشکری کے ضمن ہی میں ہے۔ تمام سماجی اور خاندانی رشتے جس میں ہم ایک دوسرے کا لحاظ کرتے وہاں کبھی ایک فریق کو فائدہ پہنچتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔ کبھی ایک کو مفاہمت کرنی پڑتی ہے کبھی دوسرے کو۔ کبھی کسی کو اپنی جائز بات چھوڑنا پڑتی ہے کبھی کسی کو۔ ایک اعتبار سے دیکھیں تو یہی معاشرت کا حسن ہے اور یہی عمدہ اخلاقی تربیت کا ظہور ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی فریق اس طرح فائدہ اٹھاتا ہے کہ دوسرے کو وہ اس کا جائز حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور جانتے بوجھتے حق تلفی کرتا رہتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات نمایاں کر کے اسی خرابی پر متنبہ کیا ہے۔

اس روایت سے متعلق ایک ضمنی بحث یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ کب ہوا۔ ایک رائے یہ ہے کہ مشاہدہ ان مشاہدات میں سے ایک ہے جو آپ کو معراج کے موقع پر ہوئے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ حضور کو یہ مشاہدہ کسوف کی نماز پڑھتے ہوئے کرایا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے۔ ان پر وحی والہام اور مشاہدہ ملکوت کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا دونوں امکانات برابر ہیں۔ کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔ بہرحال شارحین بالعموم اسے معراج ہی سے متعلق مانتے ہیں۔

اس روایت سے متعلق دوسری ضمنی بحث یہ ہے کہ کیا جہنم میں زیادہ عورتیں ہوں گی۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس میں اس طرح کی کوئی بات یا اشارہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہنم میں وہی لوگ جائیں گے جن کے اعمال میں برے اعمال کا غلبہ ہوگا اور یہ وعید ہر مسلمان کے لیے ہے اس میں عورتوں کے زیادہ ہونے یا کم ہونے کا کوئی سبب بھی نہیں ہے۔ اس روایت کی قابل قبول توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جہنم کا جو حصہ آپ کو دکھایا گیا اس میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ اس معنی کو لینے کا ایک قرینہ روایت میں بھی موجود ہے۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''دکھائی گئی'' کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ اسلوب بھی بتاتا ہے کہ اس کلام میں عورتوں کے زیادہ جہنمی ہونے کی خبر نہیں ہے۔ حضور کو جہنم کے جس حصے کا مشاہدہ کرایا گیا اس میں زیادہ عورتیں تھیں۔

متون

اس روایت کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بات کہنے کے محل کے بیان کرنے سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیرات کی نصیحت کرنے کا بیان ہے اور تیسرے حصے میں عورتوں کی اہلیت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

امام مسلم کی زیر بحث روایت میں وہ حصہ نہیں ہے جس میں اس گفتگو کا موقع بیان ہوا ہے۔ اس روایت کے دوسری کتب میں منقول متون سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو کسی عید کے موقع پر کی تھی۔ بعض متون میں یہ وضاحت بھی نقل ہوئی ہے کہ حضور مردوں سے خطاب کے بعد عورتوں کی طرف آئے تھے اور وہاں آپ نے عورتوں کو الگ سے نصیحت کی تھی۔ بظاہر قرائن یہی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور باتیں بھی اس موقع پر فرمائی ہوں گی لیکن کتب روایت میں روایت نہیں ہوسکیں۔

دوسرا حصہ تقریباً تمام کتب روایت میں یکساں ہے۔ بعض روایات میں البتہ عورتوں کا فرمان نبی سن کر اپنے کانٹے اتار کر دینے کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فرق محض لفظی ہیں۔

تیسرا حصہ عورتوں کی اہلیت پر تبصرے پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بعض مرویات میں صرف ناقصات والی بات بیان ہوئی ہے اور بعض میں نہیں۔ مراد یہ کہ اس میں صرف ناشکری والی بات بیان ہوئی ہے کہ تم شوہروں کی ناشکری بہت کرتی ہو۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس روایت کے بعض متون میں ناقصات والی بات کو صریح طور پر صحابی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ تصریح اس بیان کی اہمیت کو کم کر دیتی ہے لیکن بخاری اور مسلم جیسی کتابوں

میں یہ بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے۔ لہٰذا اس کی توجیہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس بیان کو صحابی کی طرف منسوب کرنے والی روایتیں بخاری اور مسلم سے پہلے کی تصنیفات میں ہیں۔ مثلاً اس طرح کا ایک متن المسند میں ہے اور دوسرا دارمی میں ہے۔ جن کے مصنفین کے سال وفات بالترتیب ۲۱۹ اور ۲۵۵ ہے۔ بعد میں تصنیف کی گئی کتاب ابویعلیٰ میں ایک متن میں اس بیان کی نسبت صحابی کی طرف کی گئی ہے۔ یہ تینوں روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں جبکہ وہ روایتیں جن میں اس بیان کی نسبت حضور کی طرف ہے وہ عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی نسبت سے روایت ہوئی ہیں۔

روایت کے متون میں لفظی فرق بھی ہیں۔ لیکن روایت کے سمجھنے میں جو باتیں اہم تھیں وہ ہم نے اوپر بیان کر دی ہیں۔

کتابیات

المسند، رقم ۹۲۔ مسند احمد بن حنبل، رقم ۲۱۶۹، ۲۵۳۳، ۳۱۰۵، ۳۵۶۹، ۴۰۱۹، ۴۰۳۷، ۴۱۲۲، ۴۱۵۱، ۴۱۵۲، ۵۳۴۳، ۸۸۴۹، ۱۱۳۳۳، ۱۱۳۹۹، ۱۴۱۹۶، ۱۶۱۲۶، ۱۶۱۲۷، ۲۷۰۵۸، ۲۷۰۹۳۔ سنن دارمی، رقم ۱۰۰۷، ۱۶۵۴۔ صحیح بخاری، رقم ۲۹۸، ۱۳۹۳، ۴۹۵۱۔ صحیح مسلم، رقم ۷۹، ۸۰۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۱۸۳۵، ۴۰۰۳۔ سنن ترمذی، رقم ۲۶۱۳۔ سنن کبریٰ، رقم ۹۲۰۰، ۹۲۵۷۔ سنن نسائی، رقم ۱۵۷۹، ۲۵۸۳۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۱۱۲، ۵۱۴۴، ۶۵۸۵۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۰۰۰، ۱۴۳۰، ۲۰۴۵، ۲۴۶۱۔ شرح معانی الآثار، رقم ۲۷۹۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۳۲۳، ۴۲۴۸، ۵۷۴۴، ۷۴۷۸۔ معجم کبیر، رقم ۴۲۶، ۱۲۲۹۴۔ مستدرک، رقم ۲۷۷۲، ۸۷۸۳۔ سنن بیہقی، رقم ۱۳۷۰، ۷۹۰۰، ۲۰۳۱۶۔

ریحان احمد یوسفی

کیا اللہ کے رسول قتل ہو سکتے ہیں؟

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر تدبر قرآن میں بہت تفصیل کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ وہ انبیا کرام جنھیں اللہ تعالیٰ تعالی منصب رسالت پر فائز کر دیتے ہیں، اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو دعوت حق پیش کرتے ہیں اور اس دعوت کا فیصلہ اسی دنیا میں نکل آتا ہے۔ قوم ان کی دعوت مان لیتی ہے تو عذاب الٰہی سے بچ جاتی ہے وگرنہ دنیا ہی میں ہلاک کر دی جاتی ہے۔

یہ نقطۂ نظر محض ایک نظری بات نہیں ہے۔ یہ اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک رسول تھے اور قرآن آپ کا صحیفہ رسالت ہے، اس لیے یہ سنت الٰہی قرآن کریم پر تدبر کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ جب اس اصول کو مان کر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو قرآن کریم کے بہت سے احکام کا صحیح مدعا واضح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس پہلو سے جب قرآن کریم کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو قرآن مجید روز قیامت کی ایک زندہ دلیل بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

رسولوں کے باب میں اس قانون الٰہی کا ایک جزوی اور استنباطی پہلو یہ ہے کہ جن انبیا کرام کو منصب رسالت پر فائز کیا جاتا ہے ان کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ استنباط (Derivation) قرآنی بیانات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاہم قرآن مجید کی بعض آیات بظاہر اس بات کی نفی کرتی محسوس ہوتی ہے۔ پیش نظر مضمون میں ہم اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے جس میں ان آیات کا صحیح مدعا واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی

نیز ضمناً اس قانون کی تفصیلی شرح وضاحت بھی ہو جائے گی۔

یہ کل چار آیات ہیں۔ ان میں سے تین وہ ہیں جو یہ بیان کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل نے اپنے رسولوں کو قتل کیا، جبکہ ایک آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے حوالے سے ہے۔ ہم ان دونوں قسم کی آیات پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

انبیائے بنی اسرائیل سے متعلق آیات

ہم پہلے ان تین آیات پر گفتگو کریں گے جو بنی اسرائیل سے متعلق ہیں۔ یہ آیات درج ذیل ہیں۔

''تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو تمھارے نفس کو پسند نہ آئی تو تم نے تکبر کی راہ اختیار کی۔ پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم قتل کرتے تھے''، (البقرہ 2:87)۔

''بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لایا جو ان کو پسند نہ آئی تو بعض کو جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر ڈالتے تھے''۔ (المائدہ 5:70)

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپ کہہ دیجیے کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس کئی رسول آئے، نشانیاں لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو، پھر تم نے ان قتل کیوں کیا؟ اگر تم سچے ہو''۔ (آل عمران 3:183)

ان آیات سے رسولوں کے قتل ہو جانے کی جو بات بظاہر نکلتی محسوس ہوتی ہے وہ اس کی بنیاد یہ غلط فہمی ہے کہ ان آیات میں رسول کا لفظ ٹھیک اس اصطلاحی معنوں میں آیا ہے جس معنی میں ان انبیا کرام کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ منصب رسالت پر فائز کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت نوح، ہود، صالح علیہم السلام وغیرہ۔ ہمارے نزدیک یہ مفروضہ ٹھیک نہیں ہے اور اس کے تفصیلی دلائل بھی ہم آگے دیں گے، لیکن سر دست یہ بات ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کے لفظ کے برخلاف جو قرآن میں صرف اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے، رسول کا لفظ، اپنے اصطلاحی معنوں کے علاوہ، بکثرت اپنے لغوی معنوں یعنی بھیجے ہوئے اور پیغام پہنچانے والے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے ان مقامات پر چار طرح کے مدعا کے بیان کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

۱۔ یہ لفظ عام پیغام پہنچانے والے نامہ بروں اور قاصدوں، جو کہ عام انسان ہوتے ہیں، ان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کی مثال سورہ یوسف آیت 50 میں ملتی ہے جس میں لفظ 'رسول' بادشاہ کے اس قاصد کے لیے استعمال

ہوا جوجیل میں حضرت یوسف کے پاس آیا تھا۔ارشاد ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِیْ بِهِ فَلَمَّا جَاءَ هُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَی رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللاَّتِیْ قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ .

''اور بادشاہ نے کہا کہ اسے (یعنی یوسفؑ کو) میرے پاس لاؤ۔ جب رسول (قاصد) ان کے پاس آیا تو انھوں نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہیں جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔''

۲۔ یہ لفظ اللہ کا پیغام لانے والے فرشتوں کے لیے قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے سورہ تکویر 19:81، الحاقہ 40:69 اور مریم 19:19 میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورہ مریم میں حضرت جبریل حضرت مریم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَاماً زَكِيّاً .

''انھوں نے کہا کہ میں تمھارے رب کا رسول ہوں (اور اس لیے آیا ہوں) کہ تمھیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں۔'' (مریم 19:19)

دیگر فرشتوں کے لیے رسول کا لفظ سورہ الانعام 61:6، یونس 21:10، ھود 69:11، فاطر 1:35 اور دیگر کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ ہم اختصار کے لیے صرف ایک حوالہ نقل کر رہے ہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُم حَفَظَةً حَتَّیَ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لاَ يُفَرِّطُونَ .

''اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ اور تم پر نگہبان مقرر کیے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جن تم میں سے کسی کی موت آجاتی ہے تو ہمارے رسول (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور کوتاہی نہیں کرتے''، (الانعام 61:6)

۳۔ منصب رسالت پر فائز انبیا علیہم السلام کے لیے جو اپنی قوموں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ اسی دنیا میں کر دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ بکثرت اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہم صرف دو حوالے نقل کر رہے ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَی حَتَّی يَبْعَثَ فِیْ أُمِّهَا رَسُولاً يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا (القصص 59:28)

''اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والانہیں بنتا، جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج لے، جوان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔''

اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَالۡمُؤۡتَفِکٰتِ اَتَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ. (التوبہ 70:9)

''کیا انھیں ان لوگوں کی سرگزشت نہیں پہنچی جوان سے پہلے گزرے۔قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والانہیں بنا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔''

۴۔ان انبیائے کرام کے لیے جو منصب رسالت پر مامور نہیں ہوتے لیکن تبعاً اس لفظ کا اطلاق ان پر اس لیے کر دیا جاتا ہے کہ وہ بہر حال خدا کے بھیجے ہوئے اور اسی کا پیغام لوگوں تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔اور اس حیثیت میں ان کے لیے رسول کے لفظ کا استعمال بالکل درست ہے۔

ہمارے نزدیک یہی وہ آخری مدعا ہے جس کے بیان کے لیے اس لفظ کو ان آیات میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے سوا کوئی دوسرا معنی لینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔قرآن کریم، احادیث، قدیم صحف میں بیان کردہ تاریخ اور عقل عام سب اس کی شہادت میں کھڑے ہیں۔اب ہم اپنے دلائل کو بتفصیل بیان کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید کے دلائل

سب سے پہلے قرآن مجید کو لیتے ہیں۔قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو ان کی قوموں کے مقابلے میں مغلوب نہیں ہونے دیتے۔اس بات کو اللہ تعالیٰ ایک قانون کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔مثلاً سورہ صافات میں کئی رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد اور ان کی نجات کا ذکر کرنے کے بعد سورہ کے آخر میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔فرمایا:

وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ .اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ .وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ.

''اور ہمارے خاص مرسل بندوں کے لیے ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے صادر ہو چکا ہے کہ مدد کے حق دار وہی ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہنے والا بنے گا''، (صافات 37:172-173)

یہی بات کچھ اختصار سے ایک قانون کی شکل میں سورہ مجادلہ میں یوں بیان ہوئی ہے۔

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ.

''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔ بے شک اللہ بڑا ہی زورآور اور غالب ہے''، (مجادلہ 58:21)

قرآن کے ان بیانات کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اس کے بعد یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مدد اور غلبہ کا فیصلہ سنانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو قتل ہونے کے لیے، جو مغلوبیت کی آخری شکل ہے، ان کی اقوام کے حوالے کر دیں۔

اس حوالے سے زیادہ صریح بیان سورہ مومن کا ہے جہاں فرمایا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِن بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ.

''ان سے پہلے نوح کی قوم نے تکذیب کی اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی۔ اور ہر امت نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ذریعے سے کج بحثیاں کیں تاکہ ان سے حق کو پسپا کر دیں تو میں نے ان کو پکڑ لیا۔ تو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا''، (مومن 40:5)

پہلی دو آیات سے جو نتیجہ جزوی طور پر نکل رہا ہے یہاں وہ صاف بیان ہو گیا ہے۔ یعنی جب کسی قوم نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا۔ قرآن کریم ان اجمالی بیانات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ایک رسول کی تاریخ سناتا اور بتاتا ہے کہ رسولوں کی کس طرح حفاظت کی گئی اور ان پر ہاتھ ڈالنے والوں کا انجام کیا ہوا۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ حضرت نوح 950 برس (عنکبوت 29:14) اپنی قوم میں دعوت کا کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میری دعوت تم پر گراں گزر رہی ہے تو تم اور تمھارے شریک سب مل کر جو قدم میرے خلاف اٹھانا چاہیں اٹھا لیں اور مجھے مہلت نہ دیں، مگر قوم ان کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی، (یونس 10:71)۔ جس روز انھیں اپنی مغلوبیت کا احساس ہوا، انھوں نے رب کو پکارا اور قوم برباد کر دی گئی، (قمر 54:10-16)۔ ایسی ہی مخالفت کا سامنا حضرت ھود کو پیش آیا۔ مخالفت کے اس طوفان میں انھوں نے بھی اپنی قوم کو چیلنج دیا کہ تم سب مل کر جو اقدام میرے خلاف کرنا چاہو کر دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، (ھود 11:55)۔ مگر اس چیلنج کے باوجود آپ کی قوم آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

حضرت صالح کے خلاف ان کی قوم کے نو سرداروں نے قتل کی سازش تیار کی جو اللہ تعالیٰ نے ناکام بنا دی (نمل 27:49-50)۔ حضرت ابراہیم کی قوم نے انھیں زندہ آگ میں جلانا چاہا مگر ان کے لیے آگ کو سرد کر دیا

گیا،(انبیا 21: 68-70)۔حضرت لوط کی قوم کا ان کے گھر پر حملہ ان کی تباہی کا نقطۂ آغاز بن گیا(ھود 11:78-83)۔حضرت موسیٰ فرعون جیسے جابر حکمران کے نزدیک ایک غلام قوم کے ایسے فرد تھے جن پر قتل کا الزام تھا۔آپ نے رسالت ملتے وقت اللہ تعالیٰ سے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا(قصص 28:33)۔اعلان رسالت کے بعد فرعون نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر اس کی دھمکیوں کے جواب میں آپ نے بتا دیا کہ آپ مالک دوجہاں کی پناہ میں ہیں،(مومن 40:27) اور فرعون ان سے دور رہے،(دخان 44:20-21)۔فرعون کبھی آپ پر ہاتھ نہ ڈال سکا۔جس روز اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ پر اور آپ کی قوم پر ہاتھ ڈالے وہ دریا میں ڈبو کر ہلاک کر دیا گیا اور قیامت تک کے لیے اس کو عبرت کا نمونہ بنا دیا گیا،(یونس 10:90-92)۔حضرت شعیب کی قوم ان کو سنگسار کرنا چاہتی تھی،مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی خاندانی طاقت کو ان کی قوم کی راہ میں رکاوٹ بنا دیا کہ وہ آپ کو قتل کریں (ھود 11:91)۔یہی معاملہ حضور کا ہوا جن کا خاندان کفار کی راہ میں رکاوٹ تھا کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔البتہ جب ابولہب نے خاندان کا سربراہ بننے کے بعد آپ کو خاندانی پناہ سے محروم کیا تو کفار آپ کے قتل، قید یا جلاوطن کرنے کی سازشیں کرنے لگے،مگر اللہ تعالیٰ نے ہر سازش ناکام بنا دی،(انفال 8:30)۔آپ نے اللہ کے حکم سے ہجرت کی،مگر اعلان کر دیا گیا کہ کفار آپ کو نکالنے کی سازش کرنے کے جرم کے نتیجے میں اب اس سرزمین عرب میں نہ رہ پائیں گے۔یہ رسولوں کے باب میں اللہ کی وہ سنت ہے جو وہ کبھی نہیں بدلتا،(بنی اسرائیل 17:76-77)۔

قرآن کے ان اصولی بیانات اور رسولوں کے ان واقعات کے بعد یہ ماننا بعد مشکل ہے کہ ان تین آیات میں وہ رسول مراد ہیں جنھیں اپنی اقوام پر غلبہ دیا جاتا ہے اور ان کی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دے دی کہ وہ انھیں قتل کر دیں۔خاص کر یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے بڑے رسول حضرت عیسیٰ آئے۔ان سے زیادہ یہودی کسی اور کو قتل کرنے کے خواہش مند نہیں ہو سکتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ جب رومی گورنر پیلاطس نے حضرت عیسیٰ کی جان بچانے کا ایک موقع انھیں دیا تو انھوں نے ایک ڈاکو برابا کی جان بچانے کو ترجیح دی،(انجیل مرقس 15:6-15)۔یہ الگ بات ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو قتل کرنے کا موقع انھیں نہیں دیا۔اس کے باوجود یہود و نصاریٰ میں مسیح کے مصلوب کیے جانے ہی کی داستان پھیل گئی۔مگر اس کی تردید جس شان سے قرآن نے کی ہے(نساء 4:157) وہ بہت غیر معمولی ہے۔قرآن نے واضح کر دیا کہ مسیح کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنا کر انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا،(آل عمران 3:54-55)۔

یہ ہے بنی اسرائیل میں آنے والے آخری رسول کا معاملہ۔لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی کہ کیوں حضرت عیسیٰ کو بچا کر آسمانوں میں اٹھالیا جائے اور ان کے ہم عصر حضرت یحییٰؑ کو بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہونے دیا جائے۔سوائے اس کے کہ ان واقعات کو رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی روشنی میں سمجھا جائے۔یعنی حضرت عیسیٰ رسول اللہ تھے، اسی لیے یہود ان کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور حضرت یحییٰ صرف ایک نبی تھے جن کو وہ تحفظ حاصل نہ تھا جو رسولوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اس ساری تفصیل اور پس منظر سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان آیات میں رسولوں سے مراد یحییٰ علیہ السلام جیسے انبیا ہیں نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام جیسے رسول۔

دیگر دلائل

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے حوالے سے دیگر بیانات، حدیث، صحف سماوی اور عقل عام بھی اس بات کی تائید میں کھڑے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں قتل ہونے والے لوگ رسول نہیں بلکہ نبی تھے۔قرآن پاک میں کئی مقامات مثلاً سورہ بقرہ آیت 91، سورہ آل عمران آیت نمبر 112 اور 181 سورہ نسا آیت نمبر 155 وغیرہ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ جن لوگوں کو بنی اسرائیل قتل کرتے تھے وہ انبیا کرام ہی تھے۔ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف سورہ بقرہ کے الفاظ نقل کر رہے ہیں۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ.

''ان سے پوچھو کہ اگر تم ایمان والے ہوتے تو پہلے ہی کیوں اللہ کے نبیوں کو قتل کیا کرتے۔''

حدیث میں جب بنی اسرائیل کے نظام کا ذکر کیا گیا ہے تو وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی خلافت و سیادت انبیا کے ہاتھ میں تھی۔ بخاری کی روایت ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي۔

''ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کی سیادت و قیادت انبیا کے ہاتھ میں تھی۔ جب کبھی کسی نبی کی وفات ہوتی تو اس کے بعد ایک نبی ہی اس کی جگہ سنبھالتا۔اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، ''رقم 3268۔

ظاہر ہے کہ جب ہر دور میں موجود ہی انبیا تھے تو قتل بھی وہی ہوئے ہوں گے۔قدیم صحف سماوی میں جن لوگوں کے قتل کا ذکر ہے ان میں سے دو افرا نمایاں ہے۔ایک یحییٰ اور دوسرے زکریا (خیال رہے یہ وہ زکریا نہیں

جوحضرت یحییٰ کے والد تھے)۔ یہ دونوں ہی نبی تھے رسول نہیں تھے۔

ان سب کے بعد عقل عام بھی یہ بتاتی ہے کہ رسولوں کو اپنی اقوام کے ہاتھوں قتل نہیں ہونا چاہیے۔ رسول اپنی قوم میں اس چیلنج کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان کی بات اگر نہیں مانی گئی تو اس قوم پر ہلاکت کا عذاب آ جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ قوم کے پاس رسول کے اس انتہائی سخت چیلنج کا سب سے آخری جواب کیا ہوسکتا تھا۔ یہی کہ خود رسول کو ہلاک کر دیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ رسولوں کی حفاظت نہ کرتے تو ان کی اقوام کا یہ قدم بالکل غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے عقل بھی یہ کہتی ہے کہ جس شخص کو قوم کی ہلاکت کی دھمکی کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے اسے خود تحفظ فراہم کیا جائے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر قرآن اور تاریخ کے حوالے سے بیان کیا، ایسا ہی ہوا ہے۔

ان وجوہات کی بنا ہم سمجھتے ہیں کہ نبی اسرائیل کے حوالے سے بیان کردہ ان آیات میں لفظ رسول انبیا ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور بنی اسرائیل نے جن لوگوں کو قتل کیا تھا وہ عام انبیا تھے جو منصب رسالت پر فائز نہ تھے۔ ہاں یہ بات کوئی شخص دریافت کرسکتا ہے کہ ان کو رسول کیوں کہا گیا۔ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ نبی بھی بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتے ہیں اور اسی کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ان پر اس لفظ کا لغوی استعمال قطعاً غلط نہیں جیسے فرشتوں پر اس کا استعمال غلط نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک بنی اسرائیل کے معاملے میں رسول کا لفظ دراصل ان کے اس فعل کی شناعت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کے بنی اسرائیل ایک مسلمان گروہ تھا جس میں خدا کے پیغمبروں کا تصور بالکل واضح تھا۔ ان پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ انبیا درحقیقت اللہ ہی کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ یہ اُسی کے بھیجے ہوئے ہیں، لیکن اس علم کے باجود انہوں نے اللہ کا پیغام لانے والے ان انبیا کو قتل کر دیا۔ ان کا یہ فعل ایک ایسی ہستی کا قتل تھا جس کا اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہونا یعنی رسول ہونا انہیں اچھی طرح معلوم تھا۔ اللہ کی نسبت واضح ہو جانے کے بعد کسی کا قتل کر دینا بہت بڑی بات ہے۔ اس شناعت کے اظہار کے لیے قرآن کریم نے جگہ جگہ ایک دوسرا اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ نبیوں کو بغیر کسی حق کے قتل کرتے تھے۔ مثلاً سورہ آل عمران 181 میں فرمایا:

وَقَتْلَهُمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ .

''اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا (بھی ہم نے لکھ لیا ہے)۔''

اسی بات کو سورہ بقرہ 2: 61، آل عمران 3: 31 اور 112 نیز النساء 4: 155 میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوسکتی کہ نبیوں کو حق کے ساتھ قتل کرنے کا کوئی امکان ہوسکتا ہے بلکہ یہ اظہار

شناعت کا ایک اسلوب ہے۔ ہمارے نزدیک ان آیات میں جس شناعت کو 'بغیر حق' کی قید سے واضح کیا گیا ہے، اسے زیر بحث تین آیات میں رسول کا لفظ لا کر بیان کیا گیا ہے۔

ایک فیصلہ کن دلیل

جو تین آیات اس ضمن میں پیش کی جاتی ہے، انھی آیات میں سے ایک میں یہ بات پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ بنی اسرائیل کے جن رسولوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، ان سے مراد ہی انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ یہ سورہ بقرہ کی آیت 87 ہے۔ اوپر یہ آیت آدھی نقل ہوئی ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ.

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو تمھارے نفس کو پسند نہ آئی تو تم نے تکبر کی راہ اختیار کی۔ پھر بعض کو تم جھٹلایا اور بعض کو تم قتل کرتے تھے''، (البقرہ 2:87)

اس آیت کا پہلا جملہ غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ یہ بیان کر رہے ہیں کہ ہم نے موسیٰ کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ پھر آگے بیان ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کو بنی اسرائیل نے قتل کیا اور بعض کی تکذیب کی۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد پے در پے انبیائے کرام آئے تھے نہ کہ اصطلاحی معنوں مراد لیے جانے والے رسول۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان آیات میں رسول کو اصطلاحی معنوں میں مراد لینے کے بجائے لغوی معنوں میں مراد لیا جائے۔ تبھی یہ آیت اپنے مفہوم کو درست طور پر بیان کر پائے گی۔

یہ آیت ہمارے نقطۂ نظر کی سچائی کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ تاہم جو لوگ ہم سے اب بھی اختلاف کرتے ہیں ہم ان سے یہ مودبانہ درخواست کریں گے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد مسلسل رسول آتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ہم سے اختلاف کرنے والے رسول کی اس تعریف سے مطمئن نہیں ہوں گے جو ہم نے مضمون کے آغاز میں بیان کی ہے۔ اس لیے دیگر اہل علم نے رسول کی جو بھی تعریفیں بیان کی ہیں، ان میں سے وہ جس کو چاہیں درست مان لیں اور پھر ثابت کریں کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں پے در پے وہ انبیا کرام

تشریف لائے جنھیں اصطلاحی معنوں میں رسول کہا جاتا ہے۔

اہل علم پر تو ہمارا مدعا واضح ہو چکا ہوگا لیکن عام قارئین کی سہولت کے لیے ہم تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہیں گے۔ نبی و رسول الگ الگ منصب ہوتے ہیں یہ بات قرآن پاک سے ثابت ہے، (حج 52:22)۔تمام اہل علم اس کو سمجھتے ہیں اور اپنی طرف سے نبی و رسول کا فرق متعین کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ رسولوں کے حوالے سے اصلاحی صاحب کے تحقیقی کام سے قبل سب سے زیادہ مروج اور مقبول عام تعریف یہ سمجھی جاتی تھی کہ رسول وہ ہستی ہے جو شریعت جدیدہ لے کر آئے۔ چاہے وہ شریعت پہلی دفعہ نازل ہوئی ہو یا اس قوم کے لیے نئی ہو جس کی طرف رسول کی بعثت ہوئی ہو۔

اب اس تعریف کو لیجیے اور دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت موسیٰ کے بعد سے لے کر نبی کریم تک کوئی نئی شریعت نہیں آئی۔ حضور سے پہلے آنے والا ہر بنی اور ہر رسول حضرت موسیٰ کی شریعت کی پیروی کرتا تھا۔اس تعریف کے مطابق حضرت موسیٰ کے بعد ان کی قوم بنی اسرائیل کی طرف کوئی اصطلاحی رسول آ ہی نہیں سکتا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں جن رسولوں کے پے درپے بھیجنے کا ذکر ہے وہ اصل میں انبیائے کرام ہی تھے جن کے لیے باوجوہ رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہاں بر سبیل تذکرہ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ اس مقبول عام تعریف کی رو سے خود حضرت عیسیٰ بھی منصب رسالت سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ نہ آپ شریعت موسوی سے ہٹ کر کوئی نئی شریعت لائے تھے اور نہ آپ کی بعثت بنی اسرائیل سے باہر کسی اور قوم کے لیے ہوئی تھی۔ آپ انجیل کے ساتھ تورات کی تعلیم دینے والے اور بنی سرائیل کی طرف بھیجے گئے رسول تھے۔ حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ کی بشارت، ان کے منصب کے ساتھ، ان الفاظ میں دی گئی تھی۔

> وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ.وَرَسُولاً إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ.
>
> ’’اور اللہ تعالیٰ انہیں کتاب وحکمت یعنی وتورات وانجیل کی تعلیم دے گا اور بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔‘‘، (آل عمران 3:49-48)

انجیل میں بھی حضرت عیسی نے صاف صاف کہا ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں پورا کرنے آیا ہوں (متی 5:17)۔اگر رسول تعریف اگر یہی ہے کہ وہ نئی شریعت لاتا ہے تو دیکھ لیجیے مسیح نہ کوئی نئی شریعت لائے تھے اور نہ کسی نئی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ مذکورہ بالا تعریف کی رو سے وہ رسول نہ ہوئے، مگر قرآن

انہیں بڑے اصرار سے رسول کہتا ہے اور مذکورہ بالا آیت میں بھی رسول ہی کہا ہے۔

یہی وہ مسائل ہیں جن کی بنا پر اصلاحی صاحب نے قدیم نقطہ نظر سے ہٹ کر قرآنی دلائل سے یہ واضح کیا کہ رسالت کا قرآنی تصور کیا ہے۔ الحمد للہ اب یہ نقطہ نظر اپنی قوت اور مضبوطی کی بنا پر عوام وخواص میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آیت

اب اس آیت کو لیتے ہیں جو نبی کریم سے متعلق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گذر چکے ہیں۔ پس اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس چلا جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا''، (سورہ آل عمران 3:144)۔

بظاہر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل ہو جانے کو بطور ایک امکان کے بیان کیا گیا ہے۔ تاہم زبان و بیان کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ بعض اوقات محال چیزوں کے امکانات بطور ایک مفروضے کے بیان کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے بیانات سے قائل کا منشا ہر گز یہ نہیں ہوتا کہ وہ چیزوں کے واقع ہو جانے کا بھی قائل ہے۔

کسی اور کلام کو چھوڑیے خود قرآن مجید میں اس کئی مثالیں موجود ہیں جن میں ایسی چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کا وقوع ممکن نہیں۔ ہم حضور ہی کے حوالے سے صرف دو مقامات نقل کر رہے ہیں۔

وَلَقَدۡ أُوحِيَ إِلَيۡكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنۡ قَبۡلِكَ لَئِنۡ أَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّعَمَلُكَوَلَتَكُونَنَّ مِنَ الۡخَاسِرِينَ

''اور (اے محمد) تمھاری طرف اور (ان پیغمبروں) کی طرف جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں کہ یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارے عمل برباد ہو جائیں گے اور تم زیاں کاروں میں ہو جاؤ گے''، (زمر 39:65)

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ أَهۡوَاءهُم مِّن بَعۡدِ مَا جَاءكَ مِنَ الۡعِلۡمِ إِنَّكَ إِذاً لَّمِنَ الظَّالِمِينَ

''اور اگر تم اس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان (اہل کتاب) کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے''، (البقرہ 2:145)

یہ دونوں آیات حضور کے حوالے سے مفروضہ کے اسلوب میں جو کچھ بیان کر رہی ہیں کیا ان کو دیکھ کر کوئی شخص

معاذ اللہ حضور کے لیے شرک یا اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کا کوئی امکان ثابت کرنا چاہے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں نہ ایسی کسی آیت کو اس مقصد کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کے اسلوب سے کسی چیز کے امکانات ڈھونڈنا درست نہیں۔ اس پس منظر میں کم از کم سورہ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرنا کسی طور بھی درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا قتل قرآن پاک سے ثابت ہے۔

بہر حال تمام آیات کا مدعا اور موقع محل ہم نے واضح کر دیا ہے۔ اب بھی اگر کوئی ان آیات سے رسول کے قتل کا ثبوت فراہم کرتا ہے تو اس کی مرضی۔ ہم طالبِ علم تو اس طرح کی سخن فہمی کی بس داد ہی دے سکتے ہیں۔

محمد اسلم نجمی

کاروانِ زندگی

[دینِ اسلام پر کیسے عمل ہو؟ یہ شریعت اور قانون کا موضوع ہے۔ یہ دین کیسا ہو؟ یہ حقیقت صرف قرآنِ مجید ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کاروانِ زندگی میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ہر صحیح بات استاذِ گرامی اور الامام الاستاذ کی علمی مجلسوں اور تصنیفات سے ماخوذ ہے، میری حیثیت بس ایک ناقل کی ہے۔]

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اپنی بیان کردہ نشانیوں کو سمجھنے، ان سے سبق حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے عقل کو لازم قرار دیتے ہیں: (اپنی صفات اور حقوق میں دوسروں کی حصہ داری کے بارے میں اللہ تمھیں متنبہ کرتا ہے اور) وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے کہ کیا ہم نے تم کو جو رزق اور فضل بخشا ہے اس میں تمھارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو، اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح تم ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟ (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ جو رزق اللہ نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں تم اپنے غلاموں کے لیے بھی اسی طرح کی حصہ داری تسلیم کر لو۔ تو پھر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ خدا کے حقوق میں تم اس کی مخلوقات میں سے کسی کو شریک بنا لیتے ہو۔ یہ وضاحتِ مقصد کے لیے ایک ایسی دلیل ہے کہ اس کے بعد شرک کی غلاظت سے آلودگی کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں (یعنی یہ دلائل انھی کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں جو عقل سے کام لیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقلوں پر پردے ڈال کر اور دلوں پر تالے لگا کر انھیں معطل کر رکھا ہے ان کے لیے یہ دلیلیں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ (۳۰: ۲۸)

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتابِ ہدایت میں بیان ہونے والے حقائق بالکل واضح ہیں مگر کسی بات کوتسلیم کرنے کے لیے اس کا صرف واضح ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے دو باتیں ازبس ضروری ہیں۔ایک یہ کہ مخاطب صاحبِ عقل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ حقائق کو سننے' سمجھنے اور ماننے کے لیے اپنی عقل بھی استعمال کرے کیوں کہ: (فطری اور بدیہی حقائق کی) یاددہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں (لہٰذا علم وعقل سے عاری لوگ واضح سے واضح بات سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کر پاتے) (۹:۳۹) :اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ گونگے بہرے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (۲۲:۸) انسان کا امتیازی وصف سننا اور سمجھنا ہی ہے۔اس وصف سے محروم ہو جانے کے بعد وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور بن کر رہ جاتا ہے۔اور جانور بھی بدترین جانور ـــ اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے لیکن انسان اپنی خصوصیتِ نوعی سے محروم ہو کر حیوانیت میں چوپایوں کو بھی مات دے دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر عقل وبصیرت سے کام لے تو اس کی عظمت وعروج کی کوئی حد نہیں اور اگر وہ اس خوبی سے محروم ہو جائے تو اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ہدایت وضلالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر خیر وشر کو سمجھنے اور اس میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھی ہے۔جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں' انھیں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق ملتی ہے' درجہ بدرجہ ان کے علم میں ترقی ہوتی ہے اور ان پر ہدایت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔اور وہ لوگ جو اللہ کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے اور اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے (اپنی سننے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو معطل کر کے اور عقل کو خیر باد کہہ کر) خیر وشر میں فرق وامتیاز کے وصف کو ضائع کر بیٹھتے ہیں' انھیں مزید ہدایت ملنا تو درکنار ' قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جو ہدایت انھیں فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔حضرتِ مسیح علیہ السلام نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ جو غلام ایک پیسہ میں چور ثابت ہو اس کا مالک اسے ایک لاکھ روپے کی امانت کیسے سونپے گا!

اس بارے میں یہ بات ہر وقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بسا اوقات عقل کو آفات لاحق ہو جاتی ہیں۔غصہ' لالچ، شہوات' خواہشات اور جذبات اکثر اوقات عقل پر غالب آ کر اسے معطل اور مفلوج کر دیتے ہیں۔ان صورتوں میں عقل صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی اور جذبات وشہوات کی مغلوبیت سے انسان کو انتہائی احمقانہ اور خود غرضانہ فیصلے کرنے کے لیے دلائل دینا شروع کر دیتی ہے۔اور ان صورتوں میں بعض اوقات انتہائی بے عقلی کا کام بھی بہت

معقول نظر آنے لگتا ہے۔ اور اچھا بھلا صاحبِ عقل انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس کام کی کسی بے وقوف شخص سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایسا شخص جب ہوش میں آتا ہے اور اس کی عقل ان آفات سے چھٹکارا پا کر صحیح طریقے سے سوچنے کے قابل ہوتی ہے تو اسے لازماً اپنے کیے پر حیرانی اور ندامت ہوتی ہے۔ وہ شخص اگر واقعی سلیم الفطرت ہو تو اسے اعترافِ حقیقت میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس لیے انسان جب عقل کو ان آلائشوں سے پاک کر کے غور کرتا ہے تو بالاخر اسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے جہاں قرآن اسے پہنچانا چاہتا ہے۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی کر رہا ہے دراں حالیکہ وہ اپنے نفس کو الٰہ بنا کر اس کی پرستش کر رہا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید کی ساری دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔ اس سے دور ہونے اور اس کے سمجھ میں نہ آنے کی وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عقل کی مغلوبیت، اس کا تعطل، نفس کی پرستش اور خواہشات کی پیروی ہے

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی گمراہیوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ: کیا تم نے دیکھا اس کو (جسے اللہ نے اپنی کتاب و شریعت سے نوازا لیکن اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور خواہشاتِ دنیا کے اسیر ہو کر خدا کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔ یہ وہی ہے) جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے علم کے باوجود گمراہ کر دیا! (یعنی ان کا معاملہ یہ نہیں کہ انھیں علم کی روشنی میسر نہیں آئی بلکہ حادثہ یہ ہوا کہ انھوں نے خدا کے مقابلے میں اپنی خواہشوں اور بدعات کی پیروی کی۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں اللہ نے انھیں نفس کے حوالے کر دیا۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کی ناقدری کی سزا انھیں یہ ملی کہ یہود و نصاریٰ کا یہ طبقہ ہدایت کی روشنی سے محروم ہو گیا) اور (اللہ نے) اس (اس قبیل کے ہر شخص) کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا! بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے اس کے بعد کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا! کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے (کہ اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کو ہدایت کی نعمت سے سرفراز کرتے ہیں جو اس کی قدر کرتے ہیں۔ جو لوگ علم و معرفت کی دشمنی اور خواہشاتِ نفس کی غلامی میں اس ہدایت کی ناقدری کرتے ہیں، ان کے لیے وہ ہدایت ہی ضلالت کا پھندا بن جاتی ہے اور وہ خدا کے رسول اور اس پر نازل ہونے والی کتاب پر بے سروپا اعتراض کر کے اپنے ضمیر کو سلانے اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں) (۴۵: ۲۳)

وہ شخص جو اپنے نفس کو اپنا الٰہ بناتا ہے وہ دو کام کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ صحیح اور غلط کا فیصلہ اللہ کے بجائے اپنے نفس کو پوچھ کر کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی ترجیحات بھی اللہ کے مقابلے میں اپنے نفس کی پیروی میں طے کرتا ہے۔ اس کے پیچھے حبِ دنیا (مال، اولاد اور شہرت و اقتدار) سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ یہ چیزیں جب اللہ

اور رسول کی محبت کے مقابلے میں آ جائیں تو ترجیح ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی

اسلام کا خلاصہ، دین کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا پہلا اور آخری مطالبہ عبادت ہے۔ عالم کے پروردگار کا فرمان ہے کہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو (اپنی کسی احتیاج اور ضرورت کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ) صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت (بندگی) کریں (یہی چیز ان کی خلقت کی غائت اور ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کا پورا ہونا ہر حال میں مطلوب ہے۔ اس کی خاطر تو وہ ہر چیز کو قربان کر سکتے ہیں لیکن اسے کسی چیز پر بھی قربان نہیں کر سکتے۔ اسی لیے) نہ میں ان سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں (اس لیے کہ انسان خود اپنے یا اپنی آل اولاد کی خاطر رزق حاصل کرنے کے لیے جو جدوجہد کرتا ہے وہ اس عالمِ اسباب میں اللہ کی ہدایت کا تقاضا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کی حیثیت ایک آلہ اور ذریعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی کوششوں کو بارآور کرنے والا میں ہی ہوں۔ اگر میرا فضل شاملِ حال نہ ہو تو اس کی تمام تر صلاحیتوں اور کوششوں کے باوجود ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے) اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں (بلکہ اس کے برعکس وہ اگر خدائے واحد کی بندگی پر ڈٹے رہیں تو جان لیں کہ رازقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے، سو وہ غیب سے رزق کی راہیں کھولے گا۔ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے حوالے سے کسی بھی پہلو سے محتاج یا عاجز نہیں ہے) بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور اور قوت والا ہے (۵۱: ۵۶-۵۸)

عبادت اصل میں عاجزی اور پستی ہے (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل) انسان اگر اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان رکھتا ہے اور وہ اس کی ساری صفات کے صحیح شعور کے ساتھ اسے مانتا ہے تو خدائے واحد کی بندگی کے نتیجے میں اس کے اندر انتہائی محبت اور انتہائی خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کی بنیاد اس کی بے پناہ اور بے پایاں نعمتوں کا احساس ہے جو اسے بے مانگے اور بغیر استحقاق کے ملی ہیں اور خوف کی بنیاد کسی ڈراؤنی ہستی کا خوف نہیں بلکہ اس کا سبب یہ احساس ہے کہ کہیں اس کی بے پروائی، غفلت، سرکشی اور ناشکری کے نتیجے میں اس سے یہ نعمتیں چھن نہ جائیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی بندگی کا صحیح شعور بندے کو بے پروائی اور غفلت سے بچاتا، سرکشی سے باز رکھتا اور شکر گذاری کو اس کا شب و روز کا وظیفہ بناتا ہے۔ پھر بندے کو اللہ پروردگارِ عالم کی یاد ہی سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کی ناراضی سے ڈرتا اور ہر نفس اسی کا ہو کر رہنے کو زندگی سمجھتا ہے۔ وہ پھر اپنے ہر معاملے کو اسی کے سپرد کرتا اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ سر جھکا دیتا ہے۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو واقعی خدا کی بندگی

اختیار کرنے کے نتیجے میں اس کے باطن میں رونما ہوتی ہیں۔ گویا یہ باطن کی عبادت ہے۔ اسی سے خدا کی مطلوب سچی بندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بندگی بندے کے اندر سے باہر کی طرف سفر کرتی ہے۔ اور جیسے اس کا باطن اللہ تعالیٰ کے حضور پوری آمادگی کے ساتھ جھکا ہوا ہوتا ہے اسی طرح اس کا ظاہر بھی اللہ پروردگارِ عالم کے سامنے جھکنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور پھر شریعت اسے بتاتی ہے کہ خدا کی بندگی کا صحیح اور پسندیدہ طریقہ کیا ہے۔

خدا کی بندگی کی بنیاد تقویٰ' مطلوب رویہ احسان اور آخری نتیجہ تزکیہ نفس ہے۔

تقویٰ حدود شناسی کا نام ہے۔ اسے خدا سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بات یہاں پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ سے ڈرنے اور بندوں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بندے پر خدا کے جتنے (اور جیسے) حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ دوسری یہ کہ خدا نے اپنی حدوں کو پامال کرنے اور انھیں توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کے دنیوی فائدے اور اخروی فلاح و نجات کے لیے ہے۔ ان حدود کی پابندی سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس کا سارا فائدہ بندوں ہی کو ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ کبھی بھی کوئی اللہ تعالیٰ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا: اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو (اور سب کچھ) دیکھتا ہے (کسی بھی حال میں تمھارا خیر و شر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا) (۵۷:۴) اور چوتھی بات یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں جب چاہے اور جتنی چاہے سزا دے سکتا ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھیے اور اللہ تعالیٰ کی اہلِ ایمان کو دی گئی اس ہدایت کو سمجھیے کہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو (۱۰۲:۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی خشیت کا حق ادا کرنا بندوں کے بس ہی میں نہیں ہے' اسی لیے دوسری جگہ پر یہ وضاحت فرما دی کہ: جہاں تک ہو سکے تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (۱۶:۶۴) بندگی کے تقاضے پورے کرنے کی جو ذمہ داری انسان پر ڈالی گئی ہے' بے شک وہ ایک بھاری ذمہ داری ہے مگر' اس کے بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ: اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا (۲۸۶:۲) جو چیز اس کے حدود و اختیار اور امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اسی طرح دین و شریعت میں مجبوریوں کی صورت میں رخصتیں بھی اسی لیے دی گئی ہیں کہ بندوں پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس محبت اور انکسار کو صرف اور صرف اللہ (اور اس کے رسول) ہی کے لیے خاص

کر دینا اور اس میں کسی بھی درجے میں دوسروں کو شریک نہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے (اور یہ انتہا نہ مطلوب ہے اور نہ بندگی کا لازمی تقاضا ہے) والدین، بہن بھائیوں، بیوی بچوں اعزا و اقارب اور دنیاوی مال و منال سے محبت اور ان کے لیے ایثار و انکسار اور میلان ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس باب میں بندہ مومن سے بس اتنا تقاضا ہے کہ جب کبھی ان کی محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے مقابل میں آجائیں تو ترجیح ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوگی۔ اگر ایسا ہو تو پھر اللہ اور رسول کی محبت کے ساتھ ان محبتوں کا جمع ہونا بندگی کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ عین دین کا تقاضا قرار پاتی ہیں اور خدا کی بندگی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ یہ اور اس طرح کی ساری محبتیں ہر حال اور ہر صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے تابع رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کی پہلی ترجیح قرار پائے۔

کیا اللہ واقعی بندہ مومن کی پہلی ترجیح بن گیا ہے؟ اس سوال کا جواب (اور اس کی پہچان) یہ ہے کہ بندہ مومن کے دل میں اللہ (پر سچا ایمان) اور خوفِ دنیا اور بے یقینی اکھٹے نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ پر سچا ایمان موجود ہے تو پھر Fear & Frustration کے اس کے ساتھ باہم یک جا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر اسے وہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی یاد کا لازمی تقاضا ہے: سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے (۱۳: ۲۸) اگر دلوں کا اطمینان، ایمان کی روشنی اور شرحِ صدر کی نعمتیں مطلوب ہیں تو ان کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ سے لازوال اور بے عیب محبت اور اس کے حضور بے ریا عجز و انکسار ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر بندہ مومن کی پہلی ترجیح بن جائیں تو پھر خدا کا بندے سے سچا تعلق قائم رہتا ہے، اسے کبھی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور خدا کے ہاں اس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔

ہمارا عام طور پر (الا ماشاء اللہ) حال یہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی حاجات و ضروریات کے لیے اللہ کے سوا ہر در پر دستک دیتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے ہم دین اور آخرت کے تقاضوں کو بھی پسِ پشت ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور جب چاروں طرف سے ناکام اور کسی حد تک مایوس ہو جاتے ہیں تو بادل نخواستہ آخری چارہ کار کے طور پر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ معمولی غور و فکر ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس صورت میں ہماری پہلی ترجیح اللہ تعالیٰ نہیں تھا بلکہ ہم اپنی ضروریات کی تکمیل اور خواہشات کی تسکین کے لیے زمینی سہاروں سے کسی حد تک مطمین اور ان کے بارے میں پر امید تھے مگر ان سہاروں نے جب مایوس کیا اور ہمارے کسی کام نہ آئے تو پھر ہمیں خدا یاد آیا۔ ہماری پہلی ترجیح اگر اللہ تعالیٰ ہوتے تو

ہم اپنی ہرضرورت اور ہرخواہش کی تکمیل کے لیے ادھرادھر دیکھنے کے بجائے دنیوی ذرائع واسباب کوظاہری سہارا تصور کرتے اصلاً ہمارا پہلا اورآخری سہارا اللہ تعالیٰ کی تائیدونصرت ہی ہوتی۔

مطلوب ایمان

دین میں جو ایمان مطلوب ہے وہ واقعی اور حقیقی ایمان ہے۔اسی لیے قرآنِ مجید میں اسلام قبول کرنے والوں سے کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ انھیں پہلے: اے ایمان والو(کے لقب سے مخاطب کیا اور پھراس کے بعد فرمایا کہ) ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اوراس کی کتاب پر جواس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جواس نے پہلے اتاری۔اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا (۴: ۱۳۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اقرار (کہ میں مسلمان ہوں) محض ایک رسمی اور ابتدائی (لیکن نہایت ضروری) کارروائی ہے۔اس اقرار کے بعد ایمان کے مدعی سے لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ دین وشریعت کی ہدایت کے مطابق اچھے اعمال سرانجام دے اور اپنے ماحول اور دائرہ کار میں دوسروں کوحق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کرتا رہے۔اگر ایمان لانے کے بعد وہ عملِ صالح نہیں کرتا تو اسے نہایت سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس کے ایمان لانے کے عمل میں کہیں کمی موجود ہے۔ایمان لانے کے بعد بے عملی دراصل بے پروائی، سرکشی اور زبانی اقرار کا عملی انکار ہے۔یہ رویہ ایمان اور اسلام کے منافی ہے۔اوراگر وہ دوسروں کوحق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو عملِ صالح کر رہا ہے وہ دین کے مطلوب معیار پر پورا نہیں اترتا اوراس میں کوئی ظاہری یا مخفی نقص موجود ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل دین کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

ایمان لانے کا عمل کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔یہ فکروعمل کی وہ قلبِ ماہیت ہے جس کے کچھ نتائج لازماً نکلتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں جو ایمان لانے کا ذکر ہوا ہے وہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے نہ یہ کہ چند رسومات کی ادائیگی کے ساتھ محض زبانی اقرار پر اکتفا کر لیا جائے۔

یہ بات بہت اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ ایمان اور کفر ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوسکتے۔:اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا (اور خدا اور رسول کے صریح احکام کے خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون وشریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا ہوگا، تو ایسا ایمان اللہ کی بارگاہ میں ناقابلِ قبول ہے اور) اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا (۵: ۵) لہٰذا: جن لوگوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان

کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں (۳:۹۰)

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کفر یہی نہیں ہے کہ بندہ کسی چیز کا زبانی انکار کردے۔کفر یہ بھی ہے بندہ مان لینے کے بعد ایمان کے تقاضوں کے برخلاف رویہ اختیار کرے۔اور کفر یہ بھی ہے کہ بندہ دین وآخرت کے بارے میں بے پروا ہو جائے اور کفر یہ بھی ہے کہ بندہ خدا کے احکام کے مقابلے میں غفلت' بے پروائی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے۔اور کفر یہ بھی ہے کہ کتابِ الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اسے پسِ پشت ڈال کر بے عملی کا مظاہرہ کیا جائے۔اور بے پروائی اور سرکشی کی روش کو اپنا وطیرہ بنالیا جائے۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کو نظر انداز کر کے اس طرح کا من مانا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں وہی ایمان قابلِ قبول ہوگا جو اس کی شرائط کے مطابق ہوگا۔

ایمان کا لفظ عربی زبان میں صدق واعتماد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام لوازم وشرائط اور پورے یقین' اعتماد اور اعتقاد کے ساتھ اللہ کو ماننے کا نام ہے۔اس طرح کے ایمان کی پہچان یہ ہے کہ دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار کے بعد اس کا قول اور عمل اس کے گواہ بن جاتے ہیں۔قول وعمل کی گواہی بندے کے ایمان کی قبولیت کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ بسا اوقات قول اس کے دل کی تصدیق اور ایمان کے تقاضوں کے خلاف ہوتا ہے۔قول کو صداقت کے محل پر قائم رکھنے والی قوت صرف اور صرف عمل ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ایمان ہر حال میں عمل کے ساتھ جڑا رہے۔یہی وہ چیز ہے جو ہمیں من مانا ایمان اختیار کرنے سے بچا سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں اکثر مقامات پر جب ایمان کا ذکر ہوا ساتھ ہی عمل (صالح) کی شرط بھی عائد کر دی گئی۔

قرآنِ مجید سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم سے پہلی امت یہود کا جب تورات پر ایمان بس زبانی اقرار تک محدود ہو کر رہ گیا اور عملاً انھوں نے اس کی تکذیب کر دی تو قرآن کہتا ہے کہ: ان لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لاد دی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا' اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو (کہ جیسے گدھے کو اپنے اوپر لدی کتابوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں کیا ہے' اسی طرح یہود بھی حاملِ تورات ہونے کے باوجود اس میں درج اللہ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور زبان سے اقرار کے باوجود ان کے خلاف عمل کرتے ہیں) کیا ہی بری

تمثیل ہے اس قوم کی جس نے (زبانی اقرار کے بعد) اللہ کی آیات کی (ان کے خلاف عمل کر کے) تکذیب کی! اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا (اس طرح کے لوگ ہمیشہ ٹھوکریں کھانے کے لیے ہوائے نفس حوالے کر دیے جاتے ہیں) (۶۲: ۵)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم: اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ بنے۔ پھر (اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ یہ) تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمھارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تو فدیہ دے کر انھیں چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمھارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں، ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی اس لیے نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ (۲: ۸۴۔۸۶)

بنی اسرائیل کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے کبھی تورات کی کسی ایک آیت کا بھی زبانی انکار نہیں کیا۔ وہ بس تورات کے احکام کے بارے میں غفلت، بے پروائی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتے تھے، ان کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور عمل کے مواقع پر انھیں نظر انداز کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی رویے یعنی بے پروائی اور بے عملی کو کفر قرار دیا ہے۔

تورات میں بنی اسرائیل کے لیے جس طرح فدیہ دے کر قیدی چھڑانے کا حکم ہے اسی طرح یہ ممانعت بھی موجود ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کا نہ خون بہائیں گے اور نہ انھیں ان کی بستیوں سے نکالیں گے۔ انھوں نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دشمنوں کی مدد کر کے انھیں گھروں سے نکالا اور انھیں قتل کیا اور تورات کے احکام کو سر بازار پامال کیا، اور جب اپنے ہی بھائی دشمنوں کے ہاتھوں قیدی بن گئے تو انھیں فدیہ دے کر چھڑا لیا اور تاویل یہ اختیار کی کہ یہ تورات کا حکم ہے۔ اللہ کی کتاب کے بعض احکام کو ماننے اور بعض کی خلاف ورزی کرنے کو اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کفر قرار دیا ہے۔

بنی اسرئیل کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہود یہ اور اسرائیل کی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو جانے کے بعد ان میں حریفانہ کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں اطراف کے یہودی مخالف طاقتوں کو ابھار کر اپنے ہی

بھائیوں پر چڑھائی کرادیتے تھے۔اور جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوتے اور قیدی بن جاتے تو فدیہ دے کرانھیں چھڑالیتے کہ تورات کا یہی حکم ہے۔

اللہ کے کچھ دینی احکام کی پاس داری اور کچھ کی مخالفت صریح منافقت ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس روش کو الہامی کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لانے اور بعض کا کفر کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

سچا صاحبِ ایمان بندہ اپنے دل و دماغ کو اپنے پرور دگار کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ اپنا سب کچھ اللہ ہی کو سونپ کر اس کے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

جو لوگ شریعتِ الٰہی کے معاملے میں محض زبانی اقرار پر اکتفا کرتے ہوئے بے عملی کا مظاہرہ کرتے ہیں‘ وہ حالتِ کفر میں زندگی گذارتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے اس رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں‘ ان کی سزا اس دنیا میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو (۲:۸۵)

سچا اور حقیقی ایمان کوئی جامد چیز نہیں ہے۔وہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور: (اپنے ایمان کے دعوے میں سچے) ایمان والے تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جائیں (کیوں کہ انھیں اپنے رب کی جلالتِ شان اور کبریائی کا شعور ہوتا ہے۔اس لیے جب بھی کوئی بات ان کے سامنے اللہ کی بات کی حیثیت سے پیش کی جائے تو وہ اسے خوف وخشیت کے گہرے احساس اور اس پر فوری عمل پیرا ہونے کی نیت سے سنتے ہیں) اور جب اس کی آیتیں انھیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جائے (اس لیے کہ ان کی سب سے مرغوب اور مطلوب چیز خدا کی پسند و ناپسند‘ اس کی مرضیات اور اس کے احکام وقوانین ہی کا علم ہوتا ہے) اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں (ایمان کے مطالبے خواہ سخت ہوں یا نرم‘ ان سے ان کے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچے یا انھیں فائدہ ہو‘ ان کی خاطر تعلقات ٹوٹیں یا جڑیں‘ وہ ہر حال میں دین و دنیا کی فلاح اپنے رب کے احکام کی تعمیل ہی میں سمجھتے ہیں) (۸:۲)

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جہالت اور بے علمی کی بنیاد پر کیے گئے جرائم کے لیے یہ عذر قیامت میں قابلِ قبول نہ ہوگا کہ فلاں چیز کو ماننے یا کسی عمل کے کرنے کے بارے میں ہمیں معلوم نہ تھا۔ایسی صورتِ حال میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے حقیقت کو جاننے کی کتنی کوشش کی؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جاننے اور معلوم کرنے کی پوری کوشش کے باوجود ہم حقیقت کو پانے میں ناکام رہے ہوں اور اس کے نتیجے میں ایمان و عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو ایسی

صورت میں امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ عذر قبول کر لیں۔ لیکن ایسی کمی کا باعث اگر بے پروائی، غفلت اور سرکشی ہوئی تو خدشہ ہے کہ قیامت کے روز یہ قابلِ سزا جرم تصور ہو گا۔

یہ دراصل بندے کا ارادے کی آزادی اور اختیار سے کیا ہوا عمل ہے جو انھیں آخرت میں جواب دہی کا سزاوار ٹھیراتا ہے۔

(باقی)

طالب محسن

ڈاکٹر اسرار احمد کی رحلت

برصغیر پر ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب اس کے بعض بڑے دماغ خلافت راشدہ کے احیا کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس خواب نے کچھ تحریکوں کو وجود بخشا۔ ان میں سے سب سے زیادہ طاقت ور تحریک مودودی صاحب مرحوم کی اٹھائی ہوئی جماعت اسلامی کی تحریک تھی۔

جماعت اسلامی نے ایک دینی تعبیر سے جنم لیا تھا۔ چنانچہ اس کے دشمن اور دوست سبھی اس تعبیر سے متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ مودودی صاحب کو گالی دینے والے بھی انھی اصطلاحات میں کلام کرنے لگے جن سے مودودی صاحب مرحوم سے پہلے کوئی واقف نہیں تھا۔ یہ مودودی صاحب کی غیر معمولی کامیابی ہے۔

جماعت اسلامی سے الگ ہونے والا شاید ہی کوئی ہو جو اس تعبیر کا اس طرح علم بردار بن کر جیا ہو جیسے ڈاکٹر اسرار احمد جیے۔ بلکہ انھوں نے اس کی آنچ کو کچھ بلند ہی کیا۔ وہ غلبہ دین کے نعرے سے وابستہ ہوئے اور ساری زندگی اسی نعرے کو حقیقت بنانے میں صرف کر دی۔ اس نعرے کو جتنے مجاہد میسر آئے ان میں سب سے بلند آہنگ ڈاکٹر اسرار ہی تھے۔ انھوں نے شب و روز یہی کام کیا۔ دین کا غلبہ فرض ہے۔ آؤ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے میرے ناصر بن جاؤ۔

ڈاکٹر اسرار کی نمایاں خصوصیت قرآن سے وابستگی ہے۔ قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے میں جو لگن انھوں نے ظاہر کی وہ کم لوگوں کا نصیب ہے۔ قرآن کا درس دینے میں جو محنت اور تسلسل انھوں نے دکھایا برصغیر کی تاریخ میں اس حوالے سے شاید سب سے نمایاں نام انھی کا ہو۔

ڈاکٹر اسرار احمد ایک صاحب کردار شخص تھے۔ دینی شخصیتوں کا ہمارے اس زمانے میں جو حال ہے اس کو سامنے

رکھیں تو ڈاکٹر صاحب ایک بلند کردار شخصیت کے طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ جس چیز کو حق جانا بے خوف لومۃ لائم اس کے علم بردار بن کر جیے۔ اپنی بات ڈنکے کی چوٹ کہی اور اس کے نتیجے میں آنے والی مشکلات کی پروا نہیں کی۔ اپنے مقصد کے لیے جو قربانی دینی پڑی اسے دینے سے گریز نہیں کیا۔

یہ درست ہے کہ استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے معاملے میں ان کا رویہ وہ نہیں تھا جو ان کی شخصیت سے مطابقت رکھتا ہو لیکن میں اسے ان کی ایک ناکامی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ خدا انسان کے سب خیر سامنے رکھے گا۔ یقیناً ان کے کردار کا خیر غالب اس کا حق رکھتا ہے کہ اس کمی کو اہمیت نہ دی جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی حسنات قبول فرمائے۔ کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور انھیں ان کی مساعی کے اجر میں دین کے شہدا میں شمار کرے۔

نعیم احمد بلوچ

شام کی صبح، لبنان کی شام

نام کتاب: شام کی صبح، لبنان کی شام

مصنف: ڈاکٹر زاہد منیر عامر

صفحات: 160 صفحات

ناشر: تناظر مطبوعات، ۵۹۶ نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

قیمت: ۲۰۰ روپے۔

سفر نامے کو ایک محدود خود نوشت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اگر کسی عارف کی اس صائب بات کو سامنے رکھا جائے کہ کسی انسان کے اخلاق و کردار کا علم تب ہوتا ہے جب اس کے ساتھ سفر کیا جائے تو سفر نامے کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ مصنف چاہے لاکھ اپنے آپ کو چھپائے، اس کی افتادِ طبع اس کی شخصیت کو آشکار کر کے رہتی ہے۔ اس لحاظ سے سفر کا حال تحریر کرنا بلاشبہ ایک مہم کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر ایک کامیاب سفر نامے کی اولین خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ قاری کے دل میں کم از کم یہ خواہش ضرور پیدا ہو کہ وہ خود ان بلاد کی سیر کا لطف اٹھائے جس کا احوال اس نے سفر نامے میں پڑھا ہے۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو جان لیجیے کہ مصنف نے یا تو کسی غیر اہم جگہ کے سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہیں یا اس کی قوت مشاہدہ اور قوت بیان میں کمی ہے۔ لیکن زیر تبصرہ سفر نامے کا حال یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ شام اور لبنان دیکھنے کی تمنا بے تاب ہو جاتی ہے بلکہ یہ خواہش بھی ہر منظر پڑھ کر توانا تر ہو جاتی ہے کہ کاش یہ سفر اسی مصنف کے ساتھ ہو پائے!

اس سفرنامہ میں مصنف نے یہ تکنیک استعمال کی ہے کہ انھوں نے اپنا احوال خطوط کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے آٹھ ابواب اصل میں آٹھ نامے ہیں جو انھوں نے اپنے دوست پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی کو لکھے ہیں۔ مصنف نے یہ سفر دمشق یونیورسٹی میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے کیا تھا جہاں انھوں نے پاکستان کی نمایندگی کرتے ہوئے اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ''مذہبی رواداری اور فکرِ اقبال''۔ یہ مقالہ انگریزی زبان میں پڑھا گیا اور اسے کتاب کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا ہے جس سے کتاب کی معنویت دو چند ہو گئی ہے۔

لبنان اور شام کی اس حیثیت نے مصنف کو بجا طور پر بہت متاثر کیا ہے کہ وہاں انبیاء اور صحابہ اکرام سمیت بیسیوں عظیم المرتبت شخصیتوں کے مزار ہیں۔ اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے علاوہ مصنف نے سب سے زیادہ وقت انھی کی سیاحت میں صرف کیا ہے۔ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مزار بطور خاص دیکھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ یہ مزار ایک مسقّف بازار میں واقع ہے۔ وہ پوچھتے پچھاتے وہاں پہنچے۔ اس زیارت کا احوال انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ان سے پوچھا کہ یہ تو بتائیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا مزار کہاں ہے؟ انھوں اپنی دکان کے ساتھ ہی ایک جانب اشارہ کر دیا، گویا میں غیر شعوری طور پر حضرت ابو ہریرہؓ کے قدموں میں پہنچ چکا تھا۔ اسی دکان کے ساتھ ایک دروازہ تھا۔ کھچا کھچ بھرا بازار، چھوٹی سی مسجد جس میں شاید پچاس نمازی بھی نہ سما پائیں۔ نماز عشا کا وقت، جماعت ہو رہی تھی، میں نے نماز کا فریضہ ادا کیا اور اپنے بائیں جانب مزار دیکھ لیا۔ لیکن پوری طرح دیکھنے سے پہلے چاہتا تھا کہ تحیۃ المسجد اور کچھ نفل بطور تحفے نذر کروں۔ اس کے بعد سر بالیں حاضر ہوا۔ دعا پڑھی ۔۔۔۔ اصحاب صفہ میں شامل درویش طبع حضرت ابو ہریرہؓ کی درویشانہ وضع آج بھی برقرار ہے۔۔۔۔۔ زندگی میں بازاروں اور کھیتوں سے دور رہنے والا یہ درویش بازار میں پڑا ہے اور آج بھی بازار سے بے نیاز ہے۔ میں نے یہاں کافی وقت گزارا۔ اتنا کہ میں بالکل اکیلا رہ گیا اور مسجد کا خادم میرے جانے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔'' (صفحہ ۶۳۔۶۴)

اسی طرح مصنف کو امام ابن تیمیہ کا مرقد تلاش کرنے میں بھی خاصی مہم درپیش رہی۔ یہ مرقد اس قدر خستہ حالت میں تھا کہ مصنف لکھتے ہیں:

''مصنف نے ان شخصیات کے مزاروں کا جہاں حال بیان کیا ہے وہاں ان کی تاریخی حیثیت اور تعارف بھی بھی بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی منظر نگاری اتنی حقیقی اور بے ساختہ ہے قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ

مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے اور مصنف سیر دیکھتے ہوئے ان پر تبصرہ بھی کر رہا ہے۔

اپنی اس کتاب کو مصنف نے فوٹو گرافی سے بھی مزین کیا ہے۔ یہ تصویریں ان تمام اہم مقامات کی ہیں جن کی انھوں نے سیر کی۔ جن احباب اور اہم شخصیات سے انھوں نے ملاقاتیں کی، ان کے ساتھ بنائے گئے گروپ فوٹو بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ اس سے کتاب ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

کتاب کا مطالعہ بڑی شدت سے دل میں اس احساس کو اجاگر کرتا ہے کہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے تاریخی مقامات کو ختم کر کے کس قدر تنگ نظری اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اگر ان کو باقی رکھا جاتا اور وہاں آداب کی بھی پاس داری کرائی جاتی تو ان مقامات کی زیارت کرتے ہوئے اللہ کے آخری پیغمبر اور ان کے صحابہ کی جدوجہد کے مناظر ان کی عظیم اور روشن تاریخ کو ممثل کرنے میں کس قدر معاون ہوتے۔ لیکن برا ہو مذہبی انتہا پسندی کا جس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا!

یہ کتاب بلاشبہ سفرناموں میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ صاحب ذوق قارئین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔
